ڈاکٹر محمد عطریف شہباز ندوی

پروفیسر حکیم الطاف احمد اعظمی

مدرسۂ فراہی کا ایک عبقری دانش ور

۱۳؍اگست ۲۰۲۳ء بروز اتوار کو پروفیسر الطاف احمد اعظمی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کی وفات پر فیس بک پر ایک پوسٹ راقم نے لکھ دی تھی، لیکن احباب کا تقاضا ہوا کہ ایک مکمل مضمون ان پر لکھا جائے۔

اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی

یادش بخیر الطاف احمد اعظمی صاحب کا نام پہلی بار اُس وقت سنا جب راقم جامعۃ الفلاح میں فضیلت دوم کا طالب علم تھا۔ مدرسۃ الاصلاح میں علامہ فراہی پر ۱۹۹۱ء میں ایک کل ہند سیمینار ہوا تھا، جس میں راقم اپنی ناسازی طبع کی بنا پر شریک نہیں ہو پایا تھا، البتہ سیمینار میں شریک علما و دانش وروں میں سے دو نام طلبہ کے مابین بحث و گفتگو کا موضوع بنے: ان میں ایک مولانا سلطان احمد اصلاحی تھے اور دوسرے الطاف احمد اعظمی۔ صد حیف کہ اب دونوں ہی رحلت کر گئے ہیں۔

مؤخر الذکر کے خیالات پر استاد محترم مولانا عنایت اللہ سبحانی نے کلاس میں یہ ریمارک کیا کہ ''علامہ فراہی کی طرف انھوں نے بعض وہ خیالات منسوب کر دیے ہیں جو ان کی عبارتوں سے نہیں نکلتے''۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۹۹ء میں ''اصلاح'' ہی پر مولانا امین احسن اصلاحی پر سیمینار ہوا، جس میں راقم بطور مقالہ نگار کے شریک ہوا، اسی سیمینار میں شرکت کے لیے پاکستان سے مولانا اصلاحی کے تلمیذ رشید جناب خالد مسعود صاحب کا ورود مسعود ہوا تھا اور راقم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس سیمینار میں دونوں بزرگوں مولانا سبحانی

اور الطاف احمد اعظمی کے مابین تلخ علمی نوک جھونک کا مشاہدہ ہوا۔ بہر حال اس کے بعد راقم مزید تعلیم اور غم روزگار میں ایسا الجھا رہا کہ دہلی میں رہتے ہوئے بھی الطاف اعظمی صاحب سے ملاقات کا خیال بہت دنوں تک نہیں آیا، جو مدت سے دہلی میں ہی رہتے تھے۔ دہلی میں جامعہ اسلامیہ سنابل (جہاں سے راقم نے عالمیت کی ہے) نے علما کی ایک کل ہند ورکشاپ جامعہ محمد سعود الاسلامیہ سعودی عرب کے تعاون سے منعقد کی تو اس کی افتتاحی تقریب میں دوسرے اہم علما کے ساتھ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی نے بھی خطاب کیا تھا کہ اس وقت وہ جامعہ کے بانی مولانا عبد الحمید رحمانی مرحوم کے قریب تھے۔ اب خطاب کے مندرجات تو یاد نہیں، البتہ عقیدہ کے تحت انھوں نے تمام علما کے سامنے تصوف کے نظریاتی پہلوؤں پر شدید تنقید کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اسی جامعہ کے آرگن ''التوعیہ'' میں ڈاکٹر اعظمی کے کئی تفسیری مقالات شائع ہوئے اور بعض مقالات پر سلفی علما کے استدراک بھی آئے تو ان سے دید وشنید کی تقریب پیدا ہوئی۔

حکیم الطاف احمد اعظمی شمالی ہند کے مشہور ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بھاٹن پارہ میں ۲؍جولائی ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ قریب کے گاؤں سکرور میں درجۂ سوم تک پڑھنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ۱۹۵۵ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل کیے گئے، جہاں انھوں نے ۱۹۶۲ء تک پڑھا۔[1] پرائمری، ثانوی اور تین سال عربی، یعنی سات سال مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی سوم کے بعد مدرسی تعلیم بیچ میں ہی چھوڑ کر وہ عصری تعلیم کی طرف چلے گئے۔ یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ کس وجہ سے دینی روایتی تعلیم ادھوری چھوڑی، لیکن بعد میں ان کی یہ رائے سامنے آئی کہ ''مدارس کا نصاب جس میں مدرسۃ الاصلاح بھی شامل ہے غیر قرآنی ہے''۔ بہر حال پرائیویٹ امتحانات دے کر لکھنؤ کے اسٹیٹ تکمیل الطب کالج میں ایک سال پڑھا۔ وہاں کے روایتی طرز تعلیم سے اکتا کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۶۹ء میں بی یو ایم ایس کیا۔ علی گڑھ میں انھوں نے بہت متحرک زندگی گزاری، اسٹوڈنٹس پالیٹکس میں حصہ لیا، یہاں تک کہ اسٹوڈینٹس یونین کے صدر بھی رہے۔

واضح رہے کہ علی گڑھ کی اسٹوڈنٹس سیاست مسلمانان ہند کی زندگی میں بڑا اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔ ماضی میں یہیں کی سیاست سے نکل کر بہت سے مسلمان لیڈر وجود میں آئے۔ آج بھی ہند کی مسلم سیاسی وملی

---

[1] ملاحظہ ہو: حکیم نازش احتشام اعظمی اصلاحی کی کتاب ''ابنائے مدرسۃ الاصلاح کی علمی وادبی خدمات''، شائع کردہ: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

لیڈرشپ میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ تاہم علی گڑھ میں جس جذباتیت کا دور دورہ تھا اور آج بھی ہے، نوجوان الطاف احمد جو سرسید کی تحریریں پڑھنے کی وجہ سے ایک خالص عقلی اور ریشنل مائنڈ سیٹ کے آدمی بن گئے تھے وہ اس جذباتی ملی سیاست میں کھپ نہ سکتے تھے۔ وہ بہت جلدی یہاں کی سیاست سے توبہ کر کے واپس وطن آ گئے۔ اور وطن کے قریب جونپور میں مطب کرنے لگے۔ یہاں ۱۹۸۴ء تک مطب کرتے رہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی جونپور ہے جس کو شرقی سلاطین کے زمانہ میں شیراز ہند کہا جاتا تھا۔

انھوں نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ جونپور میں مطب کے زمانہ میں وہ موجودہ فکر اسلامی سے سخت بے زار ہو گئے تھے۔ علما کی تحریریں عقلی طور پر ان کو مطمئن نہیں کرتی تھیں۔ کچھ دنوں الحاد بھی ان پر طاری رہا اور روزہ نماز بھی چھوٹ گیا۔ پھر انھوں نے طے کیا کہ خود سے دین کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ بنیادی عربی آتی تھی، اس کو مزید بڑھایا اور پانچ سال راتوں کو جاگ کر انھوں نے عربی زبان پڑھی اور دینی علوم خاص کر قرآن کا خود مطالعہ کیا۔ قرآن کا مطالعہ بقول ان کے بغیر کسی تفسیر کے کیا۔ اس کے بعد اپنی پہلی کتاب ''وجود خدا کا اثبات قرآن و سائنس کی روشنی میں'' لکھی۔[۲]

اس کے بعد جامعہ ہمدرد کے بلند نگاہ بانی حکیم عبدالحمید نے الطاف احمد اعظمی کو دہلی بلایا۔ حکیم صاحب کو طب میں ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ چنانچہ ان کی تحریک پر انھوں نے Indian Institute of History on Medicine and medical Research کو بطور سینئر محقق کے جوائن کیا، جو بعد میں جامعہ ہمدرد میں تبدیل ہوا اور وہ ۲۰۰۴ء میں یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ سروس کے دوران ہی انھوں نے جامعہ ہمدرد سے 'یونانی میڈیسن میں' پی ایچ ڈی بھی کی۔ یہاں وہ تدریس کے علاوہ شعبۂ تاریخ طب و سائنس کے صدر بھی رہے۔ قرآن مجید اور تاریخ طب یہ دونوں ان کی دل چسپی کے میدان تھے۔ جامعہ ہمدرد سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ ۲۰۰۵ء میں کالی کٹ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔[۳]

بعد ازاں کچھ عرصہ کے لیے دہلی اردو اکیڈمی کے چیئرمین بھی بنائے گئے، جو ایک سرکاری منصب ہے۔

۲؎ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی نے یہ خیالات ایک انٹرویو میں ظاہر کیے، جو مدرسۃ الاصلاح کے استاد مولانا عمر اسلم اصلاحی نے اصلاح ٹی وی کی جانب سے ۱۳/ جنوری ۲۰۱۸ء کو ان سے لیا تھا۔ لنک یہ ہے:

https://www.youtube.com/watch?v=3qacJerUSbs

۳؎ اردو بک ریویو ص ۱۱۔ جولائی/اگست/ستمبر ۲۰۱۰ء اور انٹرویو مذکور۔

یادرہے کہ الطاف احمد اعظمی اردو کے باذوق شاعر بھی تھے۔اوران کادیوان بھی شائع ہوا، جس کا نام ہے: ''فغان نیم شب''۔ ایک ملاقات میں انھوں نے اپنادیوان اورایک مجموعۂ مقالات راقم کو دیا تھااوراس پر اپنے ہاتھ سے لکھا تھا: محب گرامی ڈاکٹر محمد غطریف شہبازندوی کے لیے۔کچھ عرصہ کے بعدان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'چراغ شب گزیدہ' کے نام سے دہلی سے شائع ہوا۔ان کے ادبی مقالات کا مجموعہ ''سخن ہائے گفتنی'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں شبلی، اقبال، اکبرالہ آبادی پر مختلف و متنوع پہلوؤں سے گفتگو کی ہے۔اس کے علاوہ ایک مقالہ ''اردو شاعری پر ایک اجمالی نظر ادبی تحریکات کے حوالہ سے'' لکھا ہے۔[۴]

علم کی دنیامیں الطاف احمد اعظمی پوری طرح سیلف میڈ آدمی تھے۔مزاج میں تیزی اور طبیعت میں جدت تھی۔ ذہن تحقیق کا جویا۔روایتی نقطۂ نظر سے وہ چاہے اسلامیات میں ہو یاطب کی دنیامیں ان کی نبھ نہیں پاتی تھی، اس لیے روایتی اطبا سے بھی ان کی ٹھنی رہتی اور روایتی علما سے بھی، حالاں کہ اعلیٰ درجہ کے نباض تھے۔ سوچنااور سوال اٹھانافطرت میں شامل تھااور بے لاگ انداز میں جو سمجھتے تھے، اس کا اظہار کر دیتے۔اور غالباً یہی چیز ہے جس کی وجہ سے ان میں علمی تواضع وانکساری کم اور حددرجہ خود اعتمادی و بے پناہ جرأت اظہار پائی جاتی تھی۔ بعض لوگ شاید اس کو ادعا و تعلی کی سی کیفیت سے تعبیر کریں:

کہتا ہوں وہی چیز سمجھتا ہوں جسے حق
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

الطاف احمد اعظمی صاحب کاایک اہم کارنامہ ان کی تفسیر ''میزان القرآن'' ہے، جو تین جلدوں میں مع مقدمۂ تفسیر کے مکتبہ الحسنات دہلی سے شائع ہوئی ہے۔وہ موجودہ دور کی اہم تفاسیر میں شمار کی جانی چاہیے۔اس میں مفسر نے متن قرآن، ترجمہ اور پھر حواشی دے کر تفسیری نوٹ لکھے ہیں۔انھوں نے لغت عربی اور نظم قرآن کی رعایت کی ہے۔وہ سابقہ مفسرین کی رایوں کی پابندی نہیں کرتے، حتیٰ کہ مکتب فراہی کے علما سے بھی خوب اختلاف کرتے ہیں، مثال کے طورپر سورۂ فیل کی تفسیر میں انھوں نے علامہ فراہی سے بالکل ہٹ کر تفسیر کی ہے۔[۵]وہ کہتے ہیں کہ مولانا فراہی کی تفسیر نئی ہے اوراس لحاظ سے قابل تحسین ہے، مگر وہ قرآنی نظائر کے بالکل خلاف ہے۔(دیکھیے: میزان القرآن، تیسری جلد، سورۂ فیل کی تفسیر۔ان کی راے میں ابرہہ کے لشکر کی ہلاکت

۴؎ ملاحظہ ہو: حکیم نازش احتشام اعظمی اصلاحی کی کتاب ''ابنائے مدرسۃ الاصلاح کی علمی وادبی خدمات''۔

۵؎ میزان القرآن، جلد سوم، تفسیر سورۂ فیل، ص ۱۰۱۳، شائع کردہ: مرکز تحقیق واشاعت قرآنی، نئی دہلی۔

کا سبب چیچک تھی۔ اسی کو 'طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ابابیل سنگریزے نہیں پھینک رہے تھے)۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اختلاف کی گنجایش کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں بھی انھوں نے دوسرے مترجموں اور مفسروں سے اختلاف کیا ہے، وہاں اکثر جگہوں پر ان کی راے دل کو لگتی اور اپیل کرتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ تفسیر بڑی عام فہم ہے۔

ڈاکٹر اعظمی کہتے تھے کہ ''قرآن مجید متن بھی ہے اور شرح بھی۔ علما نے قرآن کو جو مجمل قرار دیا جسے حدیث کھولتی ہے وہ بالکل غلط ہے۔''

ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ ''میں شاہ ولی اللہ محقق سے متاثر ہوا، شاہ ولی اللہ صوفی سے نہیں۔ اس کے بعد سر سید اور مولانا فراہی سے۔ سر سید برصغیر کے سب سے بڑے مفسر قرآن ہیں۔ اردو میں ان کی تفسیر سے بڑھ کر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اگر سر سید نہ ہوتے تو مولانا فراہی بھی نہ ہوتے، مولانا آزاد بھی نہ ہوتے۔''[۶]

قرآن کے ترجمہ کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ''مولانا مودودی کی تفسیر میں انشاء پردازی ہے، بڑی معلومات ہیں، لیکن ترجمہ آزاد کیا ہے اور اس وجہ سے بے شمار غلطیاں کی ہیں اگر ان کی غلطیوں کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں بن جائیں''۔[۷] (یاد رہے کہ والد ماجد علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی کی تفسیر ''مفتاح القرآن'' میں جگہ جگہ مولانا مودودی کی تفسیری غلطیوں پر گرفت کی گئی ہے، کیونکہ وہ برصغیر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی تفسیر ہے)۔

ڈاکٹر اعظمی مدرسۂ فراہی کی ترجمان اہم تفسیر ''تدبر قرآن'' کے بارے میں بھی الگ ہی خیال رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''دوسری تفاسیر کے مقابلہ میں بہت بلند اور منفرد ہے، لیکن خود مولانا فراہی کے اصولوں کی روشنی میں کم زور ہے۔ مولانا اصلاحی ابتدائی دو جلدوں میں تو اپنے استاد کے اصولوں کو برت سکے، اس کے بعد وہ اس معیار کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ہاں اس میں اطناب اور انشاء پردازی بہت ہے۔ اسی طرح ''تدبر'' کا ترجمہ بھی بہت رواں اور اچھا نہیں ہے۔ مفردات کی تحقیق اچھی کی ہے، لیکن بہت سے موضوعات پر تحقیق نہیں ہے۔[۸] مولانا فراہی کا اصل کارنامہ تاصیل (اصول سازی) ہے۔ اب اس پر مزید بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۶۔ انٹرویو مذکور۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ جادہ و منزل ۱۹۹، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی۔

تفسیر کے علاوہ بھی اعظمی صاحب کی بہت سی کتابیں ہیں، جو ان کی بصیرت و نکتہ رسی اور ناقدانہ صلاحیتوں کی گواہی دیتی ہیں، جن میں ایک اہم کتاب ''احیاء ملت اور دینی جماعتیں'' ہے، بلکہ یہی کتاب ہے جو راقم نے سب سے پہلے پڑھی اور پھر ان کا نیاز مند ہو گیا۔ اور جب تک وہ دہلی میں رہا، گاہے بگاہے ان کے ہاں حاضری ہوتی رہی۔ اس کتاب میں اعظمی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علماے دیوبند و جمعیۃ علماے ہند، نیز تبلیغی جماعت، ان سب کی فکر اور علمی و عملی کاموں کا گہرائی کے ساتھ قرآن کی روشنی میں ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی فکر پر ان کی تنقید مولانا وحید الدین خاں کے نقد سے ملتی جلتی، بلکہ مستعار ہے (اگرچہ اس کا حوالہ کہیں نہیں دیا ہے)، لیکن امام الہند مولانا آزاد اور جمعیۃ علما پر ان کی تنقید جرأت رندانہ سے کم نہیں۔ اس کتاب میں وہ بجا طور پر ایک بت شکن کے طور پر سامنے آتے ہیں، لیکن کسی اچھے ادارے سے شائع نہ ہو سکنے کی بنا پر یہ کتاب اس توجہ اور بحث و مباحثہ کا موضوع نہ بن سکی جو اس کا حق تھا۔ تیسری اہم کتاب ''خطبات اقبال ایک مطالعہ'' ہے، جس میں انھوں نے قرآن کی روشنی میں اقبال کے افکار و خیالات کا ناقدانہ مطالعہ کیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ان کی بیش تر تنقیدیں قرآن کی روشنی میں ہی ہوتی تھیں۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے عرض کیا، قرآن کی روشنی میں ہی انھوں نے برصغیر کی بڑی شخصیات آزاد، اقبال اور مودودی کا مطالعہ کیا۔ آزاد کا تو کوئی مکتب فکر نہیں، مگر اقبال کے مریدان باصفا نے ان کی تنقیدوں کا برا منایا۔ جب ان کی ''خطبات اقبال'' چھپی تو اقبال اکیڈمی اسلام آباد پاکستان کے رکن جناب خرم علی شفیق صاحب نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو یوں کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ ''اقبال کو پڑھنے اور نقد کرنے کے لیے فلسفہ جاننا بے حد ضروری ہے اور اعظمی صاحب فلسفہ سے واقف نہیں، لہٰذا ان کی تنقید القط''۔ راقم نے ''اقبال ریویو'' میں یہ تبصرہ پڑھ کر اس کی فوٹو کاپی لی اور اس کو لے کر اعظمی صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ انھوں نے غالباً اس کا جواب لکھا ہو گا، مگر راقم کو اس بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہیں چھپا یا نہیں۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی چوتھی اہم کتاب ''تفہیم سرسید'' ہے۔ اس میں انھوں نے علما کے اس رویہ پر تنقید کی ہے کہ انھوں نے سرسید کو بالکل ہی مسترد کر دیا، حالاں کہ سرسید کی تفسیر اور دوسری نگارشات میں بہت کچھ روشنی موجود ہے جس سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے مدلل انداز میں علما کے سرسید پر تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اعظمی صاحب نے اس کتاب میں سرسید کی کم زوریوں اور غلطیوں کا بھی جائزہ لیا ہے، ساتھ ہی ان کے اجتہادات اور تجدیدی رایوں کا بھی تذکرہ کیا اور ان کو سراہا ہے۔ یہ کتاب سرسید اکیڈمی

سے چھپی ہے اور مطالعات سرسیدی میں بہت کچھ اضافہ کرتی ہے۔ اس کتاب سے اور ان کی دوسری تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ الطاف صاحب سرسید کے تو بہت قائل ہیں، مگر مولانا آزاد کے شدید ناقد۔

جادہ و منزل: یہ کتاب اعظمی صاحب کے علمی مقالات کا مجموعہ ہے، جو مختلف اوقات میں لکھے گئے کچھ شخصیات پر ہیں اور کچھ موضوعاتی قسم کے ہیں۔ ان میں ابن رشد، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید کی تحریک، سرسید، شبلی، مولانا آزاد، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا منت اللہ رحمانی اور قاری محمد طیب کے اجتہاد کے اوپر ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی پر لکھتے ہوئے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا کا تصور سنت و حدیث اپنے استاد مولانا فراہی کے تصور سے بالکل الگ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''مولانا اصلاحی سنت بول رہے ہوتے ہیں، مگر ان کے ذہن میں حدیث ہوتی ہے، اس لیے بہ ظاہر سنت و حدیث کو الگ الگ قرار دینے کے باوجود وہ عملاً دونوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں''۔[9]

اس کے علاوہ تصوف کے ناقدانہ مطالعہ کے ضمن میں ''وحدت الوجود ایک غیر اسلامی نظریہ'' ہے، جو کافی دقیق بحثوں پر مشتمل ہے اور وحدت الوجود کے تار و پود بکھیر دیتی ہے۔

''توحید کا قرآنی تصور'' اور ''ایمان و عمل کا قرآنی تصور''۔ یہ دونوں کتابیں بھی بنیادی نوعیت کی ہیں اور اصلاحی نقطۂ نظر رکھتی ہیں۔ ان تینوں کتابوں میں ڈاکٹر اعظمی بجا طور پر توحید کے بارے میں بہت حساس نظر آتے ہیں اور امت مسلمہ میں بڑی شدت کے ساتھ پائی جانے والی اولیا پرستی اور شرک کی دوسری صورتوں کے خلاف شمشیر براں۔

ان کی ایک اہم کتاب ''مولانا حمید الدین فراہی کے بنیادی افکار'' نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ان تحریروں کو جمع کیا گیا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مولانا فراہی کے افکار پر لکھی ہیں۔ مثلاً ایک مقالہ کا عنوان ہے: ''حدیث کے بارے میں مولانا فراہی کا نقطۂ نظر''، ''فی ملکوت اللہ مولانا فراہی کی ایک اہم تصنیف''، ''تفہیم انجیل اور مولانا فراہی''۔ ''نظریۂ نظم قرآن اور مولانا فراہی''۔

ڈاکٹر اعظمی نے شبلی پر کئی جہتوں سے لکھا ہے۔ شبلی کی تنقید، انشاء پردازی، ندوۃ العلما اور علما سے ان کا تعامل وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب ''سیرت النبی'' کے علمی جائزہ پر بھی لکھی ہے، جس میں ان کا کہنا ہے کہ ''شبلی کی سیرت النبی اردو کی سب سے عظیم سیرت ہے۔ مگر اس میں بھی کمیاں رہ گئی ہیں۔ یہ

9۔ جادہ و منزل ۲۰۳، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی۔

زیر تصنیف تھی شبلی اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے تھے۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی نے افسوس کہ اپنے استاد کے ساتھ وفا نہیں کی۔ شبلی کے معمولی اعتزال کو انھوں نے اپنی اہل حدیثیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ شبلی کی بہت سی عبارتیں بدلیں۔ مقدمہ میں اپنی طرف سے بہت کچھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سب کا جائزہ لیا ہے۔''[۱۰]

بنیادی طور پر ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی مدرسۂ فراہی سے ہی وابستہ خیال کیے جاتے ہیں، مگر یہ بات بڑی عجیب ہے کہ اپنی تحقیقات اور فکر و خیال کے لیے وہ کسی بھی شخصیت کا حوالہ دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے حج کا سفر نامہ بھی لکھا۔

ان کے علاوہ بھی اعظمی صاحب کی متعدد کتابیں ہیں۔ کئی ابھی شائع بھی نہیں ہو سکی ہیں۔ وہ معارف، ترجمان دار العلوم، التوعیہ، التبیان وغیرہ رسالوں میں برابر چھپا کرتے۔ وہ بہترین مقرر، اور مشاق Table talker تھے جو گھنٹوں اپنے موضوع پر گفتگو کا ملکہ رکھتے تھے۔ گفتگو مدلل اور منطقی ہوتی۔ عرصۂ دراز سے خانہ نشین تھے اور بہت کم لوگوں سے خلا ملا رکھتے۔ جلسوں، مذاکروں اور سیمیناروں میں جانا انھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا، یہاں تک کہ فون کا استعمال بھی بہت کم کرتے تھے۔

اعظمی صاحب کو 'کورونا' کی عالمی وبا کے دوران میں کورونا ہو گیا تھا اور وہ خاصے دنوں تک اس سے متاثر رہے، بعد میں کچھ افاقہ تو ہو گیا، تاہم ان کی صحت کافی متاثر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ان کو کینسر بھی تشخیص ہوا اور ان کی طویل علالت کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ ان کی وفات سے ایک دیدہ ور مصنف، صاحب نظر عالم، صائب الرائے مفسر اور صاحبِ بصیرت ناقد و مصلح سے مسلمانان ہند محروم ہو گئے۔ خاک سار کو ان سے ایک دور کی نسبت یہ تھی کہ وہ والد ماجد علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی کے شاگرد تھے، جن کو والد ماجد نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں پڑھایا تھا۔

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

امید ہے کہ پروفیسر الطاف احمد اعظمی مرحوم کی غیر مطبوعہ کتابیں اور مقالے بھی جلد ہی منظر عام پر آئیں گے اور نئی نسل اس نئی علمی صدا کی طرف متوجہ ہو سکے گی۔

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

[۱۰] انٹرویو مذکور۔